تشنہ آرزو

اشتیاق سعید

B-01، میرا پارا ڈائز CHS، گیتا نگر، فیس II، بالا جی چوک، میرا روڈ، (تھانے)، موبائل: 9930211461

وہ بے حس و حرکت ہاتھ میں ایک خط تھامے چار پائی پر لیٹا خلا میں ایسے تک رہا تھا گویا کوئی غیر مرئی شے دیکھ رہا ہو۔ جب کہ اُس کی آنکھ کے صحرا میں بجز سراب کے ایک بوند بھی نخلستان نہیں تھا۔ اُس کے اس خلافِ توقع رویہ پر میں حیران تھا کہ آخر اسے ہوا کیا ہے جو آج اُس کی قینچی کی مانند چلنے والی زبان خاموش ہے؟ حالانکہ وہ مزاجاً ہنس مُکھ، زندہ دِل اور شوخ طبیعت کا مالِک ہے، بات بے بات قہقہے لگانا اُس کی فطرت میں شامل ہے۔

میری حیرانی بتدریج سوچ کی صورت ماضی کی وسعتوں میں پرواز کرنے لگی۔ ہماری دس سالہ رفاقت کے دوران گزرے ناقابلِ فراموش لمحات آنکھوں کے آگے رقص کرنے لگے۔ بالخصوص آدرش نگر، اندھیری... ایک فِلم پروڈیوسر کا آفس، جہاں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں میں اسکرین پلے اور ڈائیلاگس رائٹر کی حیثیت سے پہنچا تھا۔ غالباً وہ بھی اسی غرض سے وہاں موجود تھا۔ بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی، اُلجھے بکھرے گیسو اور تفکّرات سے یکسر عاری چہرہ!... اُس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی پھر تو جیسے اُس کی نگاہ میری شباہت کے جال میں اُلجھ کر رہ گئی تھی اور میرا ذہن سوچنے لگا تھا کہ آخر یہ شخص اتنے لوگوں کی موجودگی میں محض مجھے ہی کیوں تکے جا رہا ہے۔ کہیں میرا کوئی شناسا تو نہیں جو میرے چہرے پر جمی ماہ و سال کی گرد کو اپنی نگاہوں سے کُھرچ کر مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے؟ ممکِن ہے! دِل نے تائید کی.... لیکن یادداشت کے پردے پر تو اس کا نقش تک نہیں مِلتا، ذہن نے فوراً جواز پیش کیا۔ دِل و دماغ ابھی اسی کشمکش میں گتھم گُتھا تھے کہ یکلخت اُس کے لبوں نے جُنبش کی:

''آپ.... آپ ندیم اعظمی.... ؟''

''جی .... جی ہاں! .... لیک.... لیکن آپ؟''۔ اُس کے یکبارگی استفسار پر میں بوکھلا گیا تھا۔

''میرا نام بیراگی ہے.... اُلفت علی بیراگی''۔ اُس نے مُصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ میں نے بھی لاشعوری طور پر اُس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام کر نہایت گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ ''ندیم صاحب.... خاکسار بھی اعظمی ہے''۔

''اعظمی!'' میرے چہرے پر استعجاب کا جال تن گیا۔

''یعنی کہ خاکسار بھی اعظم گڑھ ہی کا باشندہ ہے''۔

''اوہ، تب تو ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے ہم وطن ٹھہرے''۔

''جی.... یہ میرے لیے سعادت کی بات ہے جو آج آپ سے بالمشافہ ملاقات ہوگئی، ورنہ اب تک میں آپ کو آپ کی تحریروں ہی کے توسط سے جانتا پہچانتا تھا''۔

''مطلب، آپ نے میری تحریریں پڑھی ہیں؟''

''جی... صرف پڑھا ہی نہیں بلکہ انھیں اپنے بطون میں سمو لیا ہے.... ندیم صاحب، یقین جانیے آپ کی ہر کہانی مجھے یوں معلوم ہوتی ہے جیسے میری اپنی کہانی ہو، کبھی کبھی تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ کہیں آپ نے میرے وجدان میں کوئی مائیکرو کیمرہ تو نہیں فِٹ کر رکھا ہے اور گھر بیٹھے میرے شب و روز، دُکھ درد، کرب و اضطراب، غم و خوشی، ذہنی کشمکش، فکری رَو اور شعوری اور غیر شعوری کیفیات کی عکس بندی کر کے انھیں اپنی سوچ کے پرسنل کمپیوٹر (PC) پر محفوظ کر لیتے ہوں اور پھر الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر صفحۂ قرطاس پر...''

اُس کا جملہ تمام ہونے سے قبل ہی میں بول پڑا۔ ''بیراگی صاحب آپ کی اس ذرّہ نوازی کا شکریہ''۔

''ذرّہ نوازی! کیسی ذرّہ نوازی؟ اور شکریہ کس بات کا؟''۔ اُس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ در آئی۔

''ابھی ابھی میری تحریروں سے متعلق آپ نے جو کچھ کہا اس سے میرا جی خوش ہوا ہے کیونکہ آج تک میری کہانیوں پر اتنا بہتر اور جامع

تاثر کسی نے نہیں دیا تھا''۔

''پلیز، آپ انھیں تاثرات کے خانے میں نہ رکھیں، یہ میرے جذبات ہیں جنھیں میں نے گزشتہ دس برسوں سے دِل کے ایک گوشے میں سینت کر رکھ چھوڑا تھا''۔اُس کی آواز بھرّا گئی تھی، میں نے لپک کر اُسے اپنے سینے سے لگالیا اور اُس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا:

''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں ساتھ ہی اپنی قسمت پہ بھی نازاں ہوں کہ مجھے آپ سا حساس قاری میسر آیا ہے''۔اس نے میرے سینے سے الگ ہوکر انتہائی گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور ملتجیانہ لہجے میں گویا ہوا:

''ندیم صاحب! اگر اجازت دیں تو میں اپنے دِل کی سرگزشت آپ پر واضح کروں''۔

''بالکل کریں صاحب، اس میں اجازت کیسی''۔

''ندیم صاحب ....آپ کو دیکھ کر جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے زندگی کی کڑی دھوپ میں مجھے کوئی شجر سایہ دار میسّر آ گیا ہو، جس کی خنکی تپتے جسم ہی کونہیں روح کو بھی فرحت بخش رہی ہے....دِل کو ایک انجانی سی تسکین اور باطن کے تلاطُم میں یکسر ٹھہراؤ آ گیا ہو اور یقین جانیے آپ سے ملاقات میرے لیے کسی بشارت سے کم نہیں''۔

بولتے ہوئے اُس کی آواز بھرّا گئی تھی اور آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے،لیکن وہ میرا ہاتھ اُسی گرم جوشی سے تھامے ہوئے تھا اور اُس کی نمیدہ آنکھیں میرے چہرے پر کچھ اس طرح جمی تھیں جیسے میرے وجود کو اپنے اندر سمولینا چاہتی ہوں۔ چند لمحات تو میں یوں ہی ساکت و جامِد رہا، پھر میرے اندر نہ جانے کن جذبوں کا سیلاب اُمڈ آیا اور دِل کے ریگزار کو جل تھل کر گیا۔

پھر آہستہ آہستہ شام کا سورج ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا.... رات نے کائنات پر اپنی زُلفیں بکھیر دیں۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا....رفاقت بڑھتی گئی، حتیٰ کہ ہم ایک ہی چھت تلے رہنے لگے۔ کام بھی ساتھ ہی کرتے، کام کیا ہوتا بس یوں جان لیں کہ کام کے نام پر ہمیں گھوسٹ رائٹنگ کرنی پڑتی جس کا معاوضہ برائے نام ملتا، کریڈٹ بھی کسی اور کے حصّے میں جاتا۔ البتہ کبھی کبھار تیسرے درجہ کے کم سرمایہ والے پروڈیوسروں کی بھی فلمیں لکھنے کے لیے مل جاتیں۔ آج تک اس قبیل کی فلمیں یا تو رائٹنگ ٹیبل تک ہی محدود رہیں یا پھر مہورت کے بعد بند ہو گئیں۔ ایسی فلمیں لکھنے سے ہمیں محض یہی فائدہ ہوا کہ جب تک رائٹنگ کا کام جاری رہا ہم کھانے پینے کی فکر سے بے نیاز ہے۔

اسی آن میرے موبائل کا بزر چنگھاڑنے لگا اور میری سوچ کی پرواز لینڈنگ سے قبل ہی کریش (Crash) ہوگئی۔ میں نے فوراً موبائل فون اُٹھا کر اسکرین کا جائزہ لیا، کال ایک اسٹرگل آرٹسٹ کی تھی چنانچہ میں نے اُسے ریسیو نہیں کیا اور بزر بجتے بجتے خود بخود خاموش ہو گیا۔ میں نے موبائل فون کو جیب میں ٹھونستے ہوئے غیرارادی طور پر نگاہیں اس کی جانب موڑ دیں۔ وہ اُسی طرح لیٹا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تلخی، تُرشی، کلیوں کی مانند مسلی کُچلی آرزوئیں، پروانوں کی طرح جل کر تڑپتی خواہشیں کسی بھوکے اژدہا کی طرح اُس کے وجود کو نگل جانا چاہتی ہوں۔

''ندیم....کس کا فون تھا؟''اُس نے قدرے نحیف آواز میں استفسار کیا تھا۔

''کوئی اسٹرگلر تھا''۔

''اسٹرگلر تو ہم بھی ہیں''۔

''ہاں، اس جہانِ فانی میں اسٹرگل سے مفر کسے ہے؟''

''کہیں اسٹرگل کا دوسرا نام فنا تو نہیں؟''

''نہیں، فنا تو اسٹرگل کی منزل ہے۔ خیر چھوڑو یہ سب اور یہ بتاؤ تمھارے ہاتھ میں خط کیسا ہے؟''میں نے جواب کے ساتھ ساتھ اُس پر سوال داغ دیا تھا۔

''بھیّا نے لکھا ہے''۔

''کیا لکھا ہے بھیّا نے؟''

جواباً اُس نے خط میری جانب اُچھال دیا۔ خط اُٹھاتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا گویا اُس میں جی سُلگنے کا دھواں سمایا ہو۔ غالبًا اسی لیے تہہ کھولنے کی مجھ میں جرأت نہ ہوئی۔

''دوست! تمھیں ایسا نہیں لگتا کہ دُنیا خود غرضی کا کفن پہنے ایک مردہ جسم کی مانند ہے؟''اس سے پیش تر کہ میں اس ضمن میں کچھ کہتا وہ دوبارہ گویا ہوا۔''سب کے سب خود غرض ہو گئے ہیں۔ بھائی، بہن، ماں، باپ سب!....کچھ دیتے رہو تو بڑی آؤ بھگت ....اگر نہ دے سکو تو....؟''

میں خاموش تھا یا کہ میری زبان شل ہو چکی تھی، پتہ نہیں! البتہ میری خاموشی نے تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی اُسے چُپ ضرور کرا دیا تھا۔ پھر ایک طویل خاموشی کے بعد خود اُس نے ہی سکوت توڑا:

''ندیم''

''ہاں''

''یار بتاؤ نا، کب ہمارا اسٹرگل اختتام کو پہنچے گا؟ ہماری محنت کب رنگ لائے گی؟ کب ہمارے خواب شرمندۂ تعبیر ہوں گے؟ کامیابی کب ہماری میراث ہوگی؟ کب شہرت کی شاہراہوں پر ہم بھی فخر سے سر اُٹھا کے چل سکیں گے؟''

وہ ایک ہی سانس میں سارے سوالوں کے تیر میرے سینے میں پیوست کر کے خاموش ہو گیا....اُس کی خاموشی مجھ پر امانت کی طرح بار ہو گئی اور میں اس بار کی شدّت سے کراہنے لگا:

''نا دوست....نا، دِل چھوٹا نہ کرو، بس وقت کا انتظار کرو....وقت سے پہلے کسی کو کچھ مِلا ہے نہ ہی مِلے گا، چاہے لاکھ ہم کسی بختاور کی پیشانی سے پیشانی رگڑ لیں قسمت کا ستارہ نہیں چمکے گا''۔ میرا یہ فلسفہ سن کر اُس کے ہونٹوں پر طنزیہ مُسکراہٹ کسی مفلوج کیڑے کی طرح رینگنے لگی، پھر اُس نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے اوپر چادر کھینچتے ہوئے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہُنہ! جب وہ وقت ہی وقت پر نہ آئے تو پھر وہ وقت کس کام کا؟''

اور خود کو چادر میں مدغم کرنا چاہا۔ افسوس کہ چادر چھوٹی تھی، چنانچہ وہ سر ڈھانکتا تو پیر کھل جاتا اور پیر ڈھانکتا تو سر....! شاید وہ ''جتنی لمبی چادر ہو اُتنا ہی پیر پھیلانا چاہئے'' والا محاورہ بھول گیا تھا یا قصداً اُس محاورے پر عمل پیرا ہونا نہیں چاہ رہا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب!

اسی آن مجھے اپنے ہاتھ میں دبے خط کا خیال آیا اور میں لاشعوری طور پر خط کی تہہ کھول کر پڑھنے لگا، لکھا تھا:

''بیراگی...مجھے یقین ہے کہ تُم ایک نہ ایک دن ضرور جدوجہد کی پوتر گنگا سے دولت، عزّت اور شہرت کی ڈھیر ساری گگریاں بھر لاؤ گے....لیکن میرے بھائی ہمیں پیاس کی شدّت تو اب ہے، اگر بوند بوند پانی کی خاطر تڑپ کر آج ہم دم توڑ دیں اور بعد مرنے کے تُم امرت کا تالاب ہی کیوں نہ ہمارے ہونٹوں سے لگا دو، تو وہ کس کام کا؟''

اور میں اس جملے کے آگے ایک حرف بھی نہ پڑھ سکا کیونکہ یک بیک میری آنکھوں کے آگے میرے ضعیف والدین کے مرجھائے ہوئے چہرے رقص کرنے لگے تھے، جن کی آنکھوں میں انتظار کے کانٹے تھے اور لبوں پر آرزوؤں کی صورت تشنگی کی پپڑیاں جمی تھیں۔

◆◆◆

دلّی والے (جلد اول، دوم اور سوم)

اچھے خاکے کی تعریف یہ ہے کہ کسی شخصیت کے کچھ اہم یا منفرد پہلو، ایسی خوبی کے ساتھ اجاگر کیے جائیں کہ قاری شخصیت کو اپنے روبرو محسوس کرے اور اس کے افکار و کردار کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو مل جائیں۔

اردو اکادمی، دہلی کی طرف سے منعقدہ ''دلّی والے سمینار'' میں پڑھے جانے والے خاکوں کا مجموعہ ان اہم شخصیتوں کے قلمی خاکے جنھوں نے دلّی کی ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کے خدوخال سنوارے۔

مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین، صفحات ۳۵۷، قیمت: ۱۵۰ روپے (جلد اول) تیسرا ایڈیشن

مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین، صفحات ۵۰۶، قیمت ۱۵۰ روپے (جلد دوم) تیسرا ایڈیشن

مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین، صفحات ۲۷۲ قیمت: ۱۰۰ روپے (جلد سوم)

ناشر: اردو اکادمی، دہلی